تزکیۂ نفس

تزکیۂ عمل

(مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

علم[1] کے تزکیہ کے بعد عمل کے تزکیہ کی باری آتی ہے۔ عمل کے تزکیہ سے مطلب یہ ہے کہ عمل بجائے خود بھی ٹھیک ہو اور اس کا محرک بھی ٹھیک ہو۔ محرک کو کسی عمل کی پاکیزگی میں سب سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک عمل ظاہر میں بڑا معصوما نظر آتا ہے لیکن تحقیق کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا محرک نہایت مکروہ اور گھنونا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک عمل ظاہر میں بُرا نظر آتا ہے لیکن اس کا محرک نہایت اچھا ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ایک مریض کا کوئی عضو کاٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ بظاہر یہ فعل نہایت ظالمانہ ہے لیکن اس کے اس فعل کو کوئی شخص بھی بُرا نہیں کہتا کیونکہ اس نے یہ کام مریض کے بقیہ اعضا کو عضو فاسد کے زہر سے بچانے کے لیے کیا ہے۔ کارپوریشن ایک بنی بنائی عمارت کو منہدم کرا دیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک نہایت غلط اور نقصان رساں کام ہے لیکن اس کے اس اقدام پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ اس مکان کے ہدم میں ایک پورے شہر کی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک شخص یتیم خانہ قائم کرتا ہے، مسجد تعمیر کراتا ہے، مدرسے بنواتا ہے، ظاہر میں یہ سارے کام دین کی اور قوم کی خدمت کے کام ہیں لیکن اگر ثابت ہو جائے کہ یہ سارے کام محض دین بازی اور زراندوزی کے لیے کیے گئے ہیں تو کسی شخص کی نظر میں بھی ان کاموں کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اعمال کے بارہ میں نیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کسی شخص کا نیک سے نیک عمل بھی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں پاتا۔ اگر وہ نیت کی نیکی کے ساتھ انجام نہ دیا گیا ہو۔ اور ایک آدمی اپنے بُرے سے بُرے عمل کے مواخذہ سے بھی بچ جائیگا اگر وہ عمل اس سے بلا ارادہ و نیت کے صادر ہو گیا ہو یا نیت تو اچھی رہی ہو لیکن کسی غلطی کے سبب سے فعل غلط

[1] تزکیۂ نفس کے جو مباحث ان صفحات میں اب تک شائع ہوئے ہیں وہ تزکیۂ علم سے متعلق تھے۔ اب یہاں سے تزکیۂ عمل کا باب شروع ہوتا ہے۔

صادر ہو گیا ہو۔

انسان کے کسی قول و فعل سے متعلق نیت اور محرک کا سوال ایک لازمی نتیجہ ہے اس کے ایک ذی ارادہ اور ذی اختیار ہستی ہونے کا۔ انسان کوئی پتھر، کوئی درخت یا کوئی جانور نہیں ہے کہ اس کی صرف ظاہری حرکتوں ہی کو دیکھا جائے، ان حرکتوں کے پیچھے جو محرکات ہیں ان کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔ اگر محرکات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک انسان اور ایک حیوان میں فرق ہی کیا رہا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں انسان کے صرف انہی اعمال کی اہمیت ہے جو ارادہ و نیت کے تحت صادر ہوتے ہوں۔ جو اعمال جبر و اکراہ، یا سہو یا بلا کسی قصد و ارادہ کے صادر ہو جاتے ہیں اسلام ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہی اعمال ہیں جن کی خدا کے ہاں قبولیت یا عدم قبولیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر آدمی نے کسی کام کو نیک نیت اور نیک محرک کے تحت کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو قبول فرمائے گا اور اگر اس نے کسی کام کو برے محرک کے تحت کیا ہے تو خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی اچھا ہو لیکن وہ اصل محرک کے کھاتے ہی میں محسوب ہوگا۔ یہی حقیقت بخاری اور مسلم دونوں کی اس متفق علیہ حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

> "حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کی نیت ہی آئے گی جس نے اپنی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے کی تو اس کی ہجرت فی الواقع اللہ اور رسول کے لیے ہے لیکن جس کی ہجرت کسی غرضِ دنیوی کے لیے ہے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کے لیے ہے جس سے وہ شادی کا طالب ہے تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کے لیے اس نے فی الواقع ہجرت کی ہے۔" (ریاض الصالحین باب الاخلاص)

اسلام میں اس نیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بسا اوقات ایک آدمی ایک برائی کا ارتکاب نہیں کرتا لیکن خدا کے ہاں وہ اس کے اعمال نامہ میں لکھ لی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اسی طرح بسا اوقات وہ ایک نیکی کے کرنے کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے لیکن وہ بھی اس کے اعمال نامہ میں درج ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے کرنے کی دل سے آرزو رکھتا تھا لیکن کسی رکاوٹ کے سبب سے وہ اس آرزو کو پورا نہ کر سکا۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں جن سے ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے۔

"ابوبکرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ میں نے عرض کی کہ جو قاتل ہے اس کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے یا رسول اللہ لیکن یہ مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ آپ نے فرمایا اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔" (ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین۔ ص ۸)

دوسری حدیث جو نیک ارادہ سے متعلق ہے وہ ملاحظہ ہو۔

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے لوٹ رہے تھے کہ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا حال یہ رہا ہے کہ ہم جو گھاٹی بھی پار کی ہے اور جس وادی سے بھی ہم گزرے ہیں اس میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو کسی عذر کے سبب سے رکنا پڑا ہے" (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری)

عمل کے محرکات نیت اور محرک کی اس اہمیت کے واضح ہو جانے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنا اچھی طرح نفسیاتی تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ہمارے اندر وہ کیا کیا محرکات ہیں جو ہمیں کسی عمل پر اکساتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ محرکات ظاہر میں تو بہت سے نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کو پانچ بنیادی محرکات کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں:

ضروریات ۔ خواہشات ۔ شہوات ۔ جذبات ۔ نفس ناطقہ یا روح ملکوتی۔

مناسب ہوگا، اگر اختصار کے ساتھ ان محرکات کا ہم تعارف بھی کرا دیں۔

"ضروریات سے ہماری مراد زندگی کی وہ ابتدائی اور بنیادی ضروریات ہیں جن کے فراہم ہونے ہی پر ہماری ذات کا بقا منحصر ہے۔ یہ ضروریات انسان کو بہت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً اسے بھوک لگتی ہے تو وہ کھانا کھاتا ہے، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ تن ڈھانکنے کے لیے لباس پہنتا ہے۔ خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے پناہ گاہیں تلاش کرتا اور اسلحہ تیار کرتا ہے، موسم کی ناہمواریوں اور ناسازگاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے غذا کے ذخیرے جمع کرتا ہے۔ سردی، گرمی اور برسات کی تکلیفوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے مکان بناتا ہے۔

خواہشات کی منزل ضروریات سے ایک قدم آگے ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور پہننے کی جہاں تک اصل ضرورت

کا تعلق ہے وہ تو بہت معمولی غذا اور نہایت موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑوں سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن انسان کی فطرت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ صرف کسی نہ کسی طرح پیٹ پال لینا ہی نہیں چاہتا بلکہ قسم قسم کے لذیذ کھانوں اور لذیذ مشروبات کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ وہ صرف تن ڈھانکنے ہی پر کفایت نہیں کرتا بلکہ آرائش و زیبائش کا ذوق و شوق بھی رکھتا ہے۔ وہ صرف گرمی اور برسات سے بچنے کے لیے اپنے سر پر ایک چھت ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ آراستہ و پیراستہ کوٹھیوں اور بنگلوں کی خواہشیں بھی رکھتا ہے۔ یہی خواہشیں ہیں جو انسان کو ہزاروں لاکھوں کام کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس دنیا کی ساری چہل پہل انسان کی ان خواہشوں ہی کی پیدا کردہ ہے۔ تعلیم و تہذیب اور تمدن و ترقی کے ناموں سے آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب انہی خواہشوں کے جلوے اور کرشمے ہیں۔ آرٹ اور صنعت و حرفت کے جو مظاہر آپ دیکھ رہے ہیں سب کی تہ میں یہی خواہشیں کام کر رہی ہیں یہی خواہشیں ہیں جو ایک خاص قسم کے نظام اخلاق کو وجود میں لاتی ہیں جس میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ عزت و شہرت کی خواہش، بقائے دوام کی آرزو، تفوق اور غلبہ کی کشمکش اور مقابلہ اور تنافس کی کشاکش کو حاصل ہوتی ہے۔

شہوات کو اگرچہ خواہشات کے عنوان کے تحت بھی لایا جا سکتا تھا لیکن ہم نے اس کا ذکر ایک مستقل محرک کی حیثیت سے اس وجہ سے کرنا مناسب خیال کیا کہ اس میں اصل خواہش جنس کی ہوتی ہے، اس مرکزی خواہش سے دوسری خواہشیں جو ابھرتی ہیں ان سب کی حیثیت اسی خواہش کے لوازم و توابع کی ہوتی ہے۔ اگرچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں انسان کے وہ کیا کیا اقدامات ہیں جو محض اس کی شہوات کے مظاہر ہیں کیونکہ اس میں بہت کچھ اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن اس بدیہی حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آج آرٹ میں، صنعت میں، ادب میں اور معاشرت و تمدن میں جو نمایاں مقام اس محرک کو حاصل ہے شاید ہی کسی دوسرے محرک کو حاصل ہو۔

جذبات سے ہماری مراد محبت و ہمدردی، نفرت و عداوت، رشک و حسد، غیرت و حمیت، غصہ و انتقام وغیرہ کے جذبات ہیں۔ یہ جذبات نفس انسانی کے اندر بڑی گہری جڑیں رکھتے ہیں اور جب ظاہر ہوتے ہیں تو بڑے زور و قوت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کو کسی عمل پر ابھارنے میں ان جذبات کو نہایت موثر عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کے بہت سے بھلے اور برے کام انہی جذبات کے مظاہر ہیں۔ ان کی مثال بھاپ کی سی ہے

جاپ کو اگر صحیح طور پر کنٹرول میں رکھا جا سکے تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اگر کنٹرول میں نہ رکھا جا سکے تو اس سے بہت سے خطرے بھی ظہور میں آ سکتے ہیں۔ جذبات کی آدمی کے اندر بڑی طاقت ہیں۔ بشرطیکہ انسان ان پر قابو رکھ سکے۔ اگر ان کو قابو میں نہ رکھ سکے تو پھر ان سے زیادہ مہلک بھی کوئی اور چیز نہیں۔

نفس ناطقہ یا روح ملکوتی سے ہماری مراد وہ نور یزدانی (DIVINE SPARK) ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ڈالا ہے اور جس کو قرآن مجید میں نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (اور انسان میں مَیں نے اپنی روح پھونکی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی نور یزدانی سے مشرف ہونے کے بعد انسان فرشتوں کا مسجود بنا یہی چیز ہے جس سے اس کو خیر اور شر کی معرفت حاصل ہوئی اور اس میں اعلیٰ اقدار کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ نور چونکہ انسان کو زمین سے نہیں بلکہ آسمان سے ملا ہے اس وجہ سے اس کی لپک ہمیشہ خدا کی طرف رہتی ہے اور اگر نفس کے سفلی تقاضوں کے حجابات بہت سخت نہ ہوں تو یہ ہمیشہ انسان کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے۔ انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا، جو اس کو حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں، سرچشمہ یہی ہے۔ اسی نور کی وجہ سے انسان عقل کی رہنمائی سے نوازا گیا اور وحی والہام کی ہدایت کے لائق ٹھہرا۔ یہ ایک ملکوتی محرک ہے جو انسان کو اعلیٰ کاموں پر ابھارتا ہے اور جب انسان کوئی اعلیٰ کام انجام دیتا ہے تو اس پر اس کی تحسین کرتا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور اگر وہ کوئی برا کام کر گزرتا ہے تو اس برے کام پر اس کو ملامت بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو نفس لوامہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اس کو ایک روز جزا و سزا کے ثبوت میں ایک نہایت اہم انفسی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جو لوگ ڈارون کے مادہ پرستانہ نظریۂ ارتقاء کے اندھے بہرے معتقد ہیں وہ انسان کے اس باطنی نور سے بالکل بے خبر ہیں اور یہی بے خبری ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے بہت سے میلانات کی یا تو سرے سے کوئی توجیہ کر ہی نہیں پاتے، یا کرتے ہیں تو بالکل غلط کرتے ہیں۔ یہ لوگ ارتقاء کی بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں حالانکہ اصلی کڑی جس کی انہیں جستجو کرنی چاہیے یہ ہے جس کی نشاندہی قرآن کر رہا ہے۔

مذکورہ محرکات کی حیثیت یہی محرکات ہیں جو انسان کی تمام عملی سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ اگر انسان کے اعمال کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا ہر عمل انہی محرکات میں سے کسی نہ کسی محرک سے وابستہ نکلے گا۔

ان محرکات پر اخلاقی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو ان میں سے کسی محرک کو بھی ہم برا نہیں کہہ سکتے۔ انسانی مشین کو متحرک رکھنے اور اس کے ذاتی اور نوعی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ان میں سے ہر محرک ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی محرک کی حرکت بھی معطل ہو جائے تو انسان کی پوری مشینری میں اس سے گڑبڑ پیدا ہو جائے گی۔ جس سے اس کی ہستی کسی نہ کسی پہلو سے ضرور متاثر ہوگی۔ یا تو وہ بقائے ذات کے پہلو سے متاثر ہوگا یا بقائے نوع کے پہلو سے یا اس کی اخلاقی حیثیت مجروح ہوگی۔

ان محرکات کی یہ اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا انسان کے لیے یہ عقلاً و اخلاقاً مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان محرکات کے حوالہ کر دے اور یہ اس کو جس جس کوچہ اور جس جس وادی میں لیے پھریں وہ پھرتا رہے؟ اگرچہ دنیا میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنی باگیں اپنی خواہشوں اور اپنے جذبات ہی کے حوالہ کر چھوڑی ہیں لیکن کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے مذکورہ بالا سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ بلکہ ہر شخص یہی جواب دیگا کہ ان میں سے کوئی محرک بھی ایسا قابل اعتماد نہیں ہے کہ آدمی آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالہ کر دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اوپر کے چار محرکات ـــــ ضروریات، خواہشات، شہوت، جذبات ـــــ تو بالکل اندھے واقع ہوئے ہیں۔ یہ صرف اپنے تقاضے کو پورا کرنا اور اپنے مطلوب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ جائز طریقہ سے حاصل کیے جائیں یا ناجائز طریقہ سے۔ جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی انھیں سرے سے کوئی تمیز ہی نہیں ہے۔ یہ صرف اپنی تشنگی کے لیے سیرابی اور اپنی بھوک کے لیے غذا چاہتے ہیں اور اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح ایک بیل، ایک گھوڑا اور ایک گدھا چاہتا ہے۔ وہ اس چاہنے میں نہ کسی قانونی حد کے پابند ہیں نہ کسی اخلاقی حد کے ـــــ جس حوض اور جس چراگاہ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہو جانے کا امکان نظر آئے، یہ ان کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ یہ قناعت، ایثار اور اعتدال وغیرہ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں۔ جس طرح ایک گدھے کے پاس ہر چیز کے ناپنے اور تولنے کا پیمانہ صرف اس کا پیٹ ہی ہے اسی طرح یہ بھی ہر چیز کو بطن اور فرج ہی کے پیمانہ سے ناپتے اور تولتے ہیں۔ جن لوگوں کی زندگیاں ان محرکات کے تحت گزرتی ہیں اور وہ ان سے بالاتر کسی شرعی و اخلاقی محرک کے قائل نہیں ہیں، وہی لوگ ہیں

جن کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے کہ یاکلون کما تاکل الانعام (وہ کا کھانا پینا اسی طرح ہے جس طرح چوپایوں کا)

ان میں سے پانچواں محرک بلاشبہ اس اعتبار سے قابلِ اعتماد ہے کہ یہ ایک عقلی اور اخلاقی محرک ہے۔ اس کی روح ملکوتی اور اس کی پرواز ہمیشہ خدا کی طرف ہے اس وجہ سے اس سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ انسان کو اسی دنیا کی کسی دلدل میں پھنسا دے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ تمام خوبیوں کے ساتھ ایک نقص اس کے اندر بھی ہے۔ اور وہ ہے اس کے مزاج کا یک رخا پن۔ اپنے اس یک رُخے پن کے سبب سے اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی رو پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو یہ دوسرے محرکات کے ساتھ کوئی رواداری برتنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات ان کو نہ صرف نظر انداز کر کے بلکہ ان کو کچلتا اور پامال کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اسی سے زندگی کے اندر وہ ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں جس کے مظاہر ہم جوگیوں، راہبوں اور درویشوں کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

خامیوں کا علاج اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان محرکات میں سے کوئی محرک بھی ایسا نہیں ہے جس پر آدمی پورا پورا اعتماد کر سکے بعض اعتبارات سے اگر ان میں خوبیاں ہیں تو دوسرے پہلوؤں سے ان میں خرابیاں بھی ہیں۔ ہماری زندگی کی گاڑی کو پیچھے سے دھکیلتے رہنے کے لیے تو ان کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن گاڑی میں جو جگہ ڈرائیور کی ہے اگر اس جگہ بھی انہی کو مسلط کر دیا جائے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اندھے راہ دکھانے والے گاڑی کو کس کھڈ میں گرائیں۔

لیکن اگر یہ محرکات زندگی کے لیے ناگزیر بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر نقائص بھی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا طریقہ ہے کہ یہ اُس افراط و تفریط سے پاک ہو سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے؛

افراط و تفریط سے پاک ہونے کے لیے اسلام نے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں:

ایک یہ کہ ہمارے تمام محرکات کا حقیقی مطلوب اور اصلی نصب العین خدا کی رضا جوئی ہو۔ دوسری یہ کہ یہ محرکات شتر بے مہار نہ ہوں بلکہ اپنی تمام سرگرمیوں میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدود اور اس کی اتاری ہوئی شریعت کے قوانین کے پابند ہوں۔ (باقی صفحہ ۳۷ پر)

(بقیہ تزکیہ نفس)

خدا کی رضا جوئی کے نصب العین بن جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے محرکات اپنے تمام مادی تقاضوں اور مطلوبات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ ان کے مادی تقاضے اور مطلوبات تو بدستور قائم رہیں گے لیکن فرق یہ ہو جائے گا کہ اب تک ان کی طلب اگر نفس کو خوش کرنے کے لیے تھی تو اب ان کی طلب خدا کو خوش کرنے کے لیے ہو گی۔ اب تک ہم جو کھاتے پہنتے تھے تو اس لیے کہ نفس کا مطالبہ ہے لیکن نصب العین کے تبدیل ہو جانے کے بعد اس لیے کھائیں گے پہنیں گے کہ ہمارے رب کا حکم ہے۔ اب تک بیوی بچوں سے دلچسپی تھی تو اپنے نفس کی لذت و راحت کے لیے تھی لیکن اب ہو گی تو اس لیے کہ اس سے خدا راضی ہو۔ اب تک اگر کسی سے نفرت یا محبت تھی تو اپنے لیے تھی۔ اب اگر محبت ہو گی تو وہ بھی خدا کے لیے اور نفرت ہو گی تو وہ بھی خدا کے لیے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ یہ تبدیلی محض ایک ظاہری تبدیلی ہے یا کوئی معمولی تبدیلی ہے۔ یہ بڑی ہی اہم تبدیلی ہے جو فعل جس کی خاطر انجام دیا جائے گا اسی کا ذوق اور اسی کی پسند اس میں سب سے زیادہ نمایاں ہو گی دوسروں کی پسند اور ناپسند کا لحاظ یا تو اس میں سرے سے ہو گا ہی نہیں یا ہو گا تو بس اسی قدر جس قدر ان کی پسند اصل پسند کرنے والے کی پسند کے موافق ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ بڑا فرق ہے اس غصہ میں جو ہم اپنے نفس کا انتقام لینے کے لیے کسی پر ظاہر کرتے ہیں اور اس غصہ میں جو ہم خدا کے کسی قانون کی بے حرمتی اور اس کی شریعت کی کسی اہانت پر ظاہر کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام میں ہمارے افعال و اعمال میں سے صرف وہی اعمال و افعال مقبول ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے نصب العین کے تحت انجام دیئے گئے ہوں۔ اگر نصب العین یہ نہ ہو تو ایک عمل ظاہر میں خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو لیکن خدا کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نصب العین کے ساتھ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنا بھی عبادت ہے لیکن اگر نصب العین بدل جائے تو جہاد بھی نری دنیا داری بن کے رہ جاتا ہے۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

"جو کچھ بھی تم خدا کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرو گے اس پر اللہ کے ہاں اجر پاؤ گے، یہاں تک

کہ اس لقمہ پر بھی اجر پاؤ گے جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے "

(ریاض الصالحین : بحوالہ صحیحین)

"ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص شجاعت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص حمیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، تیسرا شخص ریا کی وجہ سے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں صرف اس کی جنگ ہے جو اس لیے لڑے کہ خدا کے دین کا بول بالا ہو۔" (متفق علیہ)

خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کے معنی یہ ہیں کہ ان محرکات کو بگ ٹٹ ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر آگے بڑھتے ہوئے چلے جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ ان کے منہ میں شریعت کی لگام لگائی جائے اور ان کے پاؤں میں حدود الٰہی کی زنجیریں ڈالی جائیں۔ خدا نے کھانے پینے، پہننے، شہوانی تقاضے پورے کرنے، محبت کرنے، نفرت کرنے، حتیٰ کہ عبادت کرنے تک پر بھی بہت سی شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں جو حلال و حرام اور مکروہ و مباح کے امتیازات قائم کرتی ہیں اور ہر چیز کے فرض یا سنت یا مستحب ہونے کے درجے متعین کرتی ہیں۔ ان قیدوں اور شرطوں کا احترام نہایت ضروری ہے۔ ان کے احترام ہی سے خدا کی رضا جوئی کے اعلیٰ نصب العین تک بندہ پہنچتا ہے اور زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ میں وہ اعتدال نمایاں ہوتا ہے جو انسان کے ہر قول و فعل کو عبادت بنا دیتا ہے اگرچہ وہ قول یا فعل بظاہر کتنا ہی دنیا دارانہ ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان محرکات کے اندھے پن کا علاج وہ سرمۂ بصیرت ہے جو خدا کی رضا جوئی کے نصب العین سے حاصل ہوتا ہے اور ان کی افراط و تفریط کی بیماری شریعت کی پابندی سے دور ہوتی ہے۔

حدود الٰہی کی پابندی کیلئے دو چیزوں کی ضرورت یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد زندگی کے محرکات کو صراط مستقیم پر پا بر جا رکھنے کے لیے رضائے الٰہی کی طلب اور حدود اللہ کی پابندی ضروری ہے۔ ایک نہایت اہم اور مشکل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان یہ مقام کس طرح حاصل کر سکتا ہے کہ خدا کی رضا جوئی کا نصب العین بھی

اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور زندگی کے تمام نشیب و فراز اور اس کے مخفی اور بعید سے بعید گوشوں میں بھی وہ حدودِ الٰہی کی نگہداشت قائم رکھ سکے؟

یہ مقام حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔

ایک ذکرِ الٰہی اور دوسری فکرِ آخرت۔ ان دونوں چیزوں پر مفصل بحث تو آگے اپنے اپنے مقام پر آئے گی لیکن مختصراً ان کا تعارف یہاں بھی ضروری ہے۔

ذکرِ الٰہی | ذکرِ الٰہی سے ہماری مراد ذکرِ الٰہی کی مداومت ہے ہم چوبیس گھنٹوں میں جتنے موڑ بھی مڑتے ہیں ہر موڑ پر خدا کو یاد کر لینا چاہیے۔ اس سے ہمیں یہ تنبیہ ہوتا رہے گا کہ ہم کہیں کوئی غلط موڑ نہ مڑ جائیں۔ نیز ہر کام کے دوران میں بھی بار بار اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ دورانِ کار میں ہم بھول کر کہیں سے کہیں نہ جا نکلیں۔ یہ یاد بیداری، ہوشیاری اور فہم و شعور کے ساتھ ہونی چاہیے تاکہ یہ زبان کی محض ایک ورزش بن کے نہ رہ جائے اس کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی تکرار کافی نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف صفات کی یادداشت کا ذہن نشین ہونا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ہر قدم پر خدا سے رہنمائی اور مدد بھی طلب کرتے رہنا چاہیے اور لغزشوں اور کوتاہیوں پر معافی بھی مانگتے رہنا چاہیے۔ اس یاد سے آدمی کا دل خدا پر جما رہتا ہے اور اگر شیطان کی چھوت سے کبھی قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سنبھال لیتا ہے۔

یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آدمی جب خدا کو بھول جاتا ہے تو خود اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ وہ دنیا میں کیوں آیا ہے؟ اس کو کس نے بھیجا ہے؟ اس دنیا کی حیات چند روزہ کے بعد اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کو جو نعمتیں ملی ہیں وہ کس نے بخشی ہیں اور کیوں بخشی ہیں؟ اس کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں وہ کس نے دی ہیں اور کیوں دی ہیں؟ اس کا مرتبہ اور درجہ کیا ہے اور جن مشاغل میں وہ زندگی گنوا رہا ہے یہ اس کے شایانِ شان بھی ہیں یا نہیں؟ خدا کو بھولتے ہی وہ ان ساری باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی حقیر خواہشوں کے پیچھے پڑ کر حیوانات سے بھی نیچے اپنے آپ کو گرا دیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم (انھوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے ان کو خود اپنے سے بے خبر بنا دیا)۔ برعکس اس کے

جب آدمی خدا کو یاد رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی یاد رکھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کی قدر و قیمت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں خدا کا خلیفہ ہوں، وہ باخبر ہوتا ہے کہ میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے مسجودِ ملائک ہوں، اس پر یہ حقیقت واضح رہتی ہے کہ اس حیات چند روزہ کے امتحان میں اگر کامیاب ہو گیا تو میں ایک ابدی زندگی کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں کا حقدار بننے والا ہوں۔ یہ چیز اس کو اپنی زندگی کے سارے معاملات میں نہایت بیدار بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی ایک ایک چیز کو اپنے رب کی امانت سمجھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

اس یاد کے لیے جیسا کہ عرض کیا گیا مداومت شرط ضروری ہے۔ جس طرح ہماری مادی زندگی کے بقا کے لیے ہر وقت سانس کی آمد و شد ضروری ہے اسی طرح ہماری روحانی زندگی کے بقا کے لیے یہ یادِ الٰہی ہر وقت ضروری ہے۔ لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ آدمی زندگی کے سارے مشاغل چھوڑ کر بس یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جائے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی اس یاد کے لیے زندگی کی کشمکشوں سے الگ تھلگ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس یاد کی اصلی برکت فکرِ معاش کی بھاگ دوڑ، تعلقات و روابط کی الجھنوں اور اقامتِ دین کی علمی و عملی سرگرمیوں ہی کے اندر ظاہر ہونی ہے۔ یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور زندگی کے تمام فرائض انجام دیتے ہوئے ہونی چاہیے۔ قرآن مجید سے ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ آل عمران کی اس آیت پر غور کیجیے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	جو خدا کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور آسمان و زمین کی صنعت پر غور کرتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب یہ کارخانہ تو نے بے مقصد نہیں بنایا ہے تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی کام عبث کرے پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات نکلتی ہے کہ ذکرِ الٰہی اور فکرِ آخرت دونوں ساتھ ساتھ ہوں تب یہ آدمی کو جادۂ حق پر استوار رکھنے میں معین ہوتے ہیں اور دوسری طرف قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم سے

الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ ذکر ایک چلتی پھرتی زندگی میں مطلوب ہے، اس کے لیے آدمی کو پاؤں توڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱؎

فکرِ آخرت فکرِ آخرت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد نتیجہ خیز اسی وقت ہوتی ہے جب بندہ اس ذکر کے ساتھ فکرِ آخرت کو بھی ملا لیتا ہے یعنی آدمی اس حقیقت کا دھیان کرتا ہے کہ یہ زندگی اور اس زندگی کی تمام نعمتیں اور لذتیں فانی ہیں۔ جو پیدا ہوا ہے اس کے لیے مرنا ضرور ہے۔ یہ موت بچے کو بھی آتی ہے، جوان کو بھی آتی ہے اور بوڑھے کو بھی آتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کی آخری گھڑی کب آ جائے گی۔ شاہ اور گدا، عالم اور جاہل، کمزور اور طاقتور سب ہی اس کے حملہ کے آگے بے بس ہیں۔ قبر کی تاریکی و تنہائی سے سب ہی کو سابقہ پیش آنا ہے۔ پھر خدا نے یہ دنیا اور یہ زندگی بے مقصد نہیں بنائی ہے کہ اسے ہم اچھی گزاریں یا بری، خدا کو اس سے کوئی بحث نہ ہو۔ وہ ضرور ہمارے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا حساب کرے گا، ہم کوئی چیز بھی اس سے چھپا نہ سکیں گے۔ ہماری ہر خیانت، ہر چوری، ہر بے ایمانی پکڑی جائے گی اور کسی کی سفارش بھی خدا کی اجازت کے بغیر ہمیں نجات نہ دلا سکے گی۔ ایمان اور عملِ صالح کے سوا کوئی چیز بھی کسی کو خدا سے قریب نہ کر سکے گی۔ خدا جس طرح رحیم اور غفور ہے اسی طرح عادل اور منصف بھی ہے اور آخرت میں جس طرح اس کی رحمت ظاہر ہو گی اسی طرح اس کا انصاف بھی ظاہر ہو گا۔ آخرت کی نعمتوں کی طرح اس کی سزائیں بھی ہمیشہ باقی رہنے والی ہوں گی اور جس طرح اس دنیا میں آخرت کی نعمتوں کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح آخرت کی سزاؤں کی شدت اور ہولناکی کا کوئی تصور بھی اس دنیا میں کرنا ممکن نہیں ہے۔

حجاباتِ ذکر و فکر اگر اس ذکر و فکر کو آدمی برابر تازہ رکھ سکے تو نہ تو خدا کی رضا طلبی کا نصب العین اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گا اور نہ حدودِ الٰہی کی نگہداشت میں اس سے بے پروائی ہو گی۔ لیکن ہماری طبیعت کی بعض کمزوریاں ایسی ہیں جو اس ذکر و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہیں۔ ان حجابات میں سب سے زیادہ عام چیز غفلت ہے۔ دوسری چیز حبِ دنیا اور زخارفِ دنیا کی محبت ہے۔ تیسری چیز ہماری خواہشات و شہوات اور ہمارے جذبات کے مطالبات ہیں۔

ان تینوں قسم کے حجابات پر اس سلسلہ کے پچھلے مباحث میں ہم گفتگو کر چکے ہیں، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان حجابات کو توڑنے کے لیے اسلام نے جو تدابیر بتائی ہیں ان پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔

غفلت کا علاج اسلام نے نماز کو بتایا ہے —— محبتِ دنیا کا علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

شہوات و خواہشات کا زور روزہ سے ٹوٹتا ہے —— اور ان تمام امراض کا جامع اور آخری علاج حج ہے۔

اب ہم بالترتیب انہی پر گفتگو کریں گے۔

۱؎ جہاں تک ذکر سے متعلق ہم اس اصولی بحث ہی پر اکتفا کرتے ہیں، آگے انشاء اللہ ذکر کے حقوق کی بحث میں اس کے فوائد، آداب، اس کے اقسام اور طریقوں پر مفصل بحث کریں گے